Vol.3 No.4 2020
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

اردو کے منتخب افسانوی ادب کا مطالعہ (1947 کے فسادات کے تناظر میں)

Urdu Fiction, a selective study (In the background of 1947 riots)

[1]محمد ریاض عابد، [2]عابد سلیم

ABSTRACT

The partition based upon two nation theory was one of the mega event sub-continents. Because of impolitic forces approximately billions people forced to migrate and millions were killed on the name of religion. Havoc was played on the name of religion in which women lost their.....inocent children burnt alive, houses were burnt which was made in years. This part not only wrested their liberty but also snatched humanity from them. It is the worst exaple in which all human values collapsed and we cannot see any example in history. Such circumstances give birth a new type litrature. We can see deep influence of this migration on litrature. Abdullah Hussain, Quratulan Haider, Khadija Mastoor, Intzaar Hussain, Qudartullah shahab have presented in ttheir writing. Some of the prominent noveles and short stories are selected to depict all these events. In these events people of both side (India and Pakistan) was involved. The third party takes advantage from the clash of these people.

Key Words: Urdu Fiction, Two nation theory, Partition, Reots between Himdu and Muslim, effects of fiction

کلیدی الفاظ: اردو افسانہ، آغاز وارتقاء، دو قومی نظریہ، ہجرت، ہندو مسلم فسادات، اردو افسانے پر اثرات

اگرچہ فسادات کا باقاعدہ آغاز تو 1947ء میں ہوا جس نے برصغیر میں زیادہ تباہی پھیلائی۔ انہیں فسادات نے براہِ راست ادب کو بھی متاثر کیا ہے جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ پہلے ہم یہ دیکھ لیتے ہیں کہ ان فسادات کی جڑیں کہاں پر ہیں۔ یعنی ہندو مسلمکئی سو سالوں سے اکھٹے زندگی بسر کر رہے تھے ان دونوں میں روایتی دشمنیاں ضرور تھیں لیکن قتل وغارت گری اور فسادات

۱۔ پی ایچ ڈی ریسرچ سکالر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور۔

۲۔ پی ایچ ڈی ریسرچ سکالر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور۔

کے ایسے واقعات کبھی بھی رونما نہیں ہوئے تھے۔ ایسا بھی ناممکن دکھائی نہیں دیتا کہ دونوں اچانک بغیر کسی وجہ کے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں۔ یقیناً کوئی تو ایسا عنصر ہے جس نے صدیوں سے آباد دو قوموں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا کر دیا۔

1857ء کی جنگ آزادی سے پہلے کہیں بھی اس طرح کے فسادات کا شائبہ تک موجود نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان فسادات کے سوتے اسی جنگ آزادی سے پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جس میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دونوں قوموں کے لوگوں میں نفرت کے بیج بوئے گئے۔ برطانوی حکمرانوں نے ہندو فرقہ واریت اور مسلم فرقہ وریت پر مبنی کتابیں لکھوا کر ہندوؤں پر یہ ظاہر کیا کہ انگریزوں نے انہیں مسلمانوں کی غلامی اور استحصال سے آزاد کرایا ہے اور اس پردے میں اپنی سیاسی جڑوں کو اور بھی مضبوط کرتے رہے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کی اکثریت کا خوف دلایا گیا تاکہ وہ بھی انگریزوں پر بھروسہ کریں اور ہندوؤں سے نفرت، اس طرح ہندو مسلم دونوں فرقے حال کے مسائل کو ماضی کی تاریخوں میں دیکھنے لگے۔

Vol.3 No.4 2020
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

تاریخ بتاتی ہے کہ 1857ء کے غدر کے بعد حکومت برطانیہ کو پوری طرح یقین ہو گیا تھا کہ اگر ان دونوں فرقوں میں اتفاق بنا رہا تو اُن کی حکومت ہندوستان میں زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ پائے گی۔اس کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے اپنی عیارانہ حکمرانہ پولیسی پھوٹ ڈالو پر تیزی سے عمل کرنا شروع کر دیا۔

حکومت نے ہندوؤں کو زندگی کے ہر میدان میں ترقی کے مواقع دیئے اس کے برعکس مسلمان اتنے ہی پیچھے جاتے رہے۔1870ء کے بعد جب ہندؤ مسلمانوں کی طرف تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگے تو انگریزوں نے سرکردہ مسلمانوں کو یہ سبق پڑھایا کہ ہندوستان کے آزاد ہونے پر تم لوگ ہندو اکثریت کے غلام ہو جاؤ گے اس طرح بڑی آسانی سے انگریزوں نے قومی تحریک کی زمین میں فرقہ ورایت کے بیج کو لگا دیا۔یہ تفرقہ روز بہ روز بڑھتا ہی گیا۔مراد آباد کے کمانڈنٹ لفٹیننٹ کرنل کوک نے لکھا۔

> ''ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم پوری طاقت کے ساتھ مختلف مذہبوں اور ذاتوں کے درمیان موجود بھید بھاؤ بنا رہنے دیں۔ہمیں یہ فرق و امتیاز ختم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔اختلاف پیدا کرو اور حکومت کرو،ہی ہندوستانی حکومت کا اصول ہونا چاہیے''(1)

یہ پودا آہستہ آہستہ تناور درخت بنتا چلا گیا اور دونوں جماعتوں کے نمائندے بھی فرقہ واریت کی زبان بولنے لگے۔قائد اعظم کا یہ کہنا کہ ہندوؤں کے پاس کبھی بھی پورے ہندوستان کا تصور نہیں رہا اسے مسلمانوں نے پورا ہندوستان بنایا اور سات سو سالوں تک حکومت کی ہے اور انگریزوں نے ہندوستان مسلمانوں سے حاصل کیا ہے۔

مولانا شوکت علی کا یہ کہنا کہ ہندو ہمیشہ غلام رہتے آئے ہیں اور غلام ہی رہیں گے۔گورو کا یہ کہنا غیر ملکیوں کے لیے صرف دو راستے ہیں وہ یہاں کی قومی ذات میں اپنے آپ کو مدغم کر لیں اور اس کا کلچر کو اپنا لیں یا پھر یہاں کی قومی ذات (مذہب) کی مہربانی پر زندہ رہیں۔مختصر یہ کہ نفرت آہستہ آہستہ بڑھتی ہی چلی گئی اس کا ایک مظاہرہ 1905ء میں بنگال کی تقسیم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔

اس نفرت اور فرقہ واریت نے دونوں فرقوں کے دلوں میں نفرت کے بیج بو دیئے جس نے نہ صرف معاشرتی ماحول کو متاثر کیا بلکہ ادیبوں اور ادب کو بھی متاثر کیا۔1947ء میں جب دونوں طرف سے ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا تو تقریباً 6 لاکھ لوگ قتل ہوئے اور ایک کروڑ چالیس لاکھ لوگوں کو ہجرت کا سامنا کرنا پڑا۔یہ سارے مناظر ہمیشہ کے لیے ادیبوں اور شاعروں کے ذہن کا حصہ بن کر رہ گئے۔جنہیں انہوں نے اپنی شاعری افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا۔لیکن اس دوران نقادوں اور محققین کی طرف سے سوال اُٹھایا گیا کہ کیا فسادات ادب کا موضوع بن سکتے ہیں۔

اس پر مختلف لوگوں کی رائے مختلف تھی۔بہر حال کوئی بھی اس بات سے انکاری نہیں تھا کہ ان کو ادب کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔کیونکہ ادیب زندگی اور معاشرے کا اک حساس ترجمان ہے جو اس کے مد و جزر اور طوفان کو احساسات،جذبات اور ہئیت کے ساتھ دلوں سے دلوں تک پہنچاتا ہے۔اس لیے کہ ادب بھی براہ راست ہماری معاشی، اقتصادی اور سماجی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے افعال و اعمال ہوتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر یا ادیب جو بھی تخلیق کرتا ہے اس میں اس کی داخلی کیفیت،اندرونی کسک،خلش اور کش مکش کو بڑا دخل ہوتا ہے۔لیکن یہ داخلی کیفیت درحقیت تمام خارجی اسباب و حالات کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں اُن تبدیلیوں نے ادب اور ادیب کو بہت متاثر کیا۔اردو ادب کی تمام نثری و شعری اصناف ان تبدیلیوں اور خون آشام لمحات کی چشم دید گواہ ہیں۔زندگی ایک انقلاب آفرین اور تغیر پذیر شے ہے۔1947ء کی تقسیم ہند کے نتیجے میں پاکستان ایک آزاد مملکت کی صورت میں دنیا کے جغرافیے پر ابھرا ہی تھا کہ اس کی خوشیوں کو کسی حاسد کی نظر لگ گئی:

> ''آزادی کا دیا پوری طرح روشن بھی نہ ہونے پایا تھا کہ فسادات کے نام سے برق و باد نے گھیر لیا۔گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر قتل و غارت کی آندھیوں میں تنکے کی طرح اُڑ گئے۔بادلوں سے پانی کی بجائے خون برسنے لگا گلی کوچے اور بستیاں

Vol.3 No.4 2020
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

اس میں ڈوب گئیں۔ آدمی کے روپ میں درندے نکل پڑے۔ برسوں کی یاری و ہمسائیگی ایک بھی کام نہ آئی۔ سارے رشتے آن کی آن میں منقطع ہو گئے۔ باپ کے سامنے بیٹیوں کی اور بھائی کے سامنے بہنوں کی عصمتیں لوٹ لی گئیں۔ کمینگی، درندگی، حرص و ہوس لوٹ مار اور قتل و خون کا ایسا بازار گرم ہوا کہ تہذیب انسانی شرم سے پانی پانی ہو گئی۔(2)

غرض ہجرت کے اُس دور میں فسادات کا سیلاب اپنی پوری خباثتوں کے ساتھ آیا اور چلا گیا مگر اپنے پیچھے زندہ مردہ، سسکتی ہوئی لاشوں کے ڈھیر چھوڑ گیا۔ صرف ملک کے ہی دو ٹکڑے نہیں ہوئے بلکہ ذہن اور جسم بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ قدریں بکھر گئیں انسانیت کی دھجیاں اُڑ گئیں گورنمنٹ کے افسر، دفتروں کے کلرک مع میز کرسی، قلم دوات اور رجسٹروں کے، مال غنیمت کی طرح بانٹ دیئے گئے اور اس کے بعد جو کچھ بچ گیا اُس پر فسادات نے دستِ شفقت پھیر دیا۔ جن کے جسم سالم رہ گئے تو اُس کے دل کے ٹکڑے ہو گئے۔ ایک بھائی پاکستان چلا آیا تو دوسرا ہندوستان ہی میں رہ گیا۔ ماں ہندوستان میں تو اولاد پاکستان میں، میاں ہندوستان میں تو بیوی پاکستان میں، خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ زندگی کے بندھن تار تار ہو گئے۔ یہاں تک کہ بہت سے جسم ہندوستان رہ گئے اور روح پاکستان چل دی۔

ایسی صورت میں ادیب سے یہ توقع کرنا کہ وہ انسانیت سوز مظالم کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لے اور اپنے ارد گرد شکست و ریخت، قتل و غارت گری اور وحشت و بربریت کے مناظر دیکھے اور بے حس بیٹھا رہے۔ بعید از قیاس ہے کیونکہ ادیب کسی معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے سوچنے، سمجھنے اور کسی چیز کو دیکھنے کا زاویہ عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔

بقول حسن عسکری:

> ''ادیب صرف ایسی چیزوں کے بارے میں لکھ سکتا ہے جو اس کے حیاتی اور ذہنی تجربے میں آچکی ہوں۔ یہ وہی چیزیں ہوتی ہیں جو ایک خاص وقت میں موجود ہوں۔ جو چیزیں آگے چل کر وجود میں آئیں گی اس کے بارے میں ادیب کچھ نہیں لکھ سکتا کیونکہ وہ اس کے تجربے سے خارج ہیں۔ چنانچہ وہ موجود چیزوں کو قائم رکھنا چاہتا ہے..... مگر ساتھ ہی ساتھ جب حالات انسان کو بدلنے پر مجبور کرتے ہیں تو ادب بھی حالات واقعات کا ہم آواز ہو جاتا ہے۔(3)

یہاں اس بات کا جاننا بھی بے حد ضروری ہے کہ چاہے ادیب ہو یا شاعر ہر اک کا زاویہ نگاہ مختلف ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی ایک حادثے کو تمام لوگ ایک ہی نظر سے دیکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہند کے فسادات کے متعلق بھی لکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کا ردِ عمل ایک سا نظر نہیں آتا۔ بعض نے فسادات کی ہو بہو تصویر کشی کر دی ہے تو بعض نے اشاروں میں ذکر کیا ہے۔ بعض ادیبوں کے نزدیک تخیل آمیزی کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ انور سجاد نے فرقہ واریت پر بہت کم لکھا ہے لیکن اُن کا ایک افسانہ ''نہ مرنے والا'' ملتا ہے۔

''نہ مرنے والا'' میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات اور انگریزوں کا موقع سے فائدہ اُٹھانا کو مطمح نظر بنایا گیا ہے۔ دو ایسے ہی کردار اس افسانے میں دونوں فرقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جس میں سے ایک دوسرے کو گولی مار دیتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو مرنے والے کی یاد سے غافل نہیں کر پاتا ''نہ مرنے والا'' اُسے ہر جگہ زندہ نظر آتا ہے۔ وہ جہاں پہنچتا ہے ''نہ مرنے والا'' یعنی وہ اُس کے سامنے موجود رہتا ہے۔ اس کے شعور سے نہ مرنے والے کی تصویر مٹ نہیں پاتی۔ افسانے میں دونوں کرداروں کے ناموں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ ہندو ہیں یا مسلمان لیکن جب ہر آدمی فائدہ حاصل کر رہا ہو تو اس کے ساتھ نہ ہونا بھی عقل مندی نہیں ہے۔ اس لیے ''وہ'' اپنے دوست کا قتل اس کے ہی گھر میں کر دیتا ہے۔ اس کا دوست منع بھی کرتا ہے کہ یہ تم کیا کر رہے ہو لیکن وہ یہ بولتے بولتے پستول داغ دیتا ہے کہ آج دراصل میں اپنے آپ کو آزاد کر رہا ہوں ''وہ'' کے تصور کی آنکھ اسے دیکھتی ہے۔

Vol.3 No.4 2020
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

"گوروں کی غلامی سے نجات پانے کا عمل شروع ہو چکا ہے اور میرے ہم وطن دیوانگی میں ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے وجود سے ہی آزاد کر رہے ہیں۔ نفرت کو نفرت سے ذبح کر رہے ہیں بلی دان، جھٹکا گھروں کو جلایا جا رہا ہے۔ لیکن مجھے کیا! آج ہر انسان کا اپنا ہی قانون ہے اور ہر کوئی اس سے فائدہ اُٹھا رہا ہے تو میں بھی کیوں نہ اُٹھاؤں میں آج یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا"۔(4)

قتل کرنے کے پہلے "وہ" سوچتا ہے کہ آج کے بعد وہ ایک نیا انسان بنے گا۔ وہ کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھے گا اور قتل کے بعد وہ کیفے ڈی سوزا جہاں دونوں دوست بیٹھ کر گھنٹوں مختلف موضوعات پر باتیں کیا کرتے تھے۔ جہاں اُن کی دوستی پختہ ہوئی تھی۔ جہاں انہوں نے انسانیت پر بڑی بڑی باتیں کی تھیں۔ وہ جس راستے سے گزر رہا تھا بالکل سنسان تھا۔ کرفیو لگا تھا۔ دونوں فرقوں کو قتل کے بعد آدمیت کا سبق سکھانے کے لیے انگریزوں نے کرفیو نافذ کر دیا تھا۔ "وہ" نے اپنے دوست کا قتل کر دیا تھا لیکن مقتول دوست اس کے ساتھ ہی چل رہا تھا۔

"اس نے گھبراہٹ میں چلتے چلتے گھوم کر پیچھے دیکھا سایہ اس کے ساتھ چند قدم چل کر آگے بڑھ گیا تھا۔ پیچھے کچھ نہیں تھا۔ زنجیر بھی نہیں بس سامنے دور تک کھمبوں کی قطار اونگھ رہی تھی۔ مکانوں میں سناٹا تھا، تاریکی تھی بلیک آوٹ نہ ہونے کے باوجود گھروں میں جیسے بلیک آوٹ تھا۔ بازار میں چپ کا راز تھا جسے اس کے چرچراتے، ٹک ٹک کرتے بوٹ مرتعش کر دیتے تھے اور یا پھر کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز یا دور سے آتے نعرے ہلا دیتے تھے۔ نیم جان شور فائر بریگیڈ کی دم گھٹی گھنٹیاں، بہت دور نہ جانے محلے کے کتے بھی کہاں غائب ہو گئے تھے"۔(5)

جب وہ کیفے ڈی سوزا میں موجود ہوتا ہے تو اُسے سامنے سڑک پر اُس کا دوست دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت میں وہ اُس کا دوست نہیں ہوتا بلکہ وہ اُس کا لاشعور ہے جو اُس کو چین نہیں لینے دیتا۔ افسانے کا انجام یہ ہے کہ انسان فرقہ پرستی کے زعم میں اس قدر اُلجھ جاتا ہے کہ پھر خیر کے احساسات اسے کچوکے لگاتے رہتے ہیں۔

عصمت چغتائی کے فرقہ واریت اور فسادات پر لکھے افسانوں میں "جڑیں" انتہائی اہم افسانہ ہے جس کی کہانی دو خاندانوں کے گرد گھومتی ہے۔ جو تین پشتوں سے اکٹھے رہ رہے تھے۔ مصنفہ نے افسانے کو پاکستان کے قیام سے شروع کیا ہے جہاں مسلمان اپنے اپنے گھروں میں دُبکے بیٹھے تھے۔ انسانی زندگی کھلونے سے سستی ہو گئی تھی۔ غیر مسلم پاکستان سے بھارت آ رہے تھے اور مسلمان بھارت سے پاکستان جا رہے تھے۔ کہیں پاکستان زندہ باد کے نعرے اور کہیں اکھنڈ بھارت کے نعرے گونج رہے تھے۔ ان نعروں نے ڈاکٹر روپ چند اور واحد متکلم کے دلوں میں دراڑ ڈال دی تھی۔

اس دراڑ میں مذید کشادگی اس وقت آ گئی جب ڈاکٹر روپ چند کے گھر پر ترنگا اور واحد متکلم کے گھر پر پاکستان کا جھنڈا لہرانے لگا۔ واحد متکلم کردار کہتا ہے کہ اُنہوں نے فرقہ واریت اور فسادات کے خوف سے گھر کا سامان باندھنا شروع کر دیا تاکہ پاکستان جا سکیں لیکن ماں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ جب پورا خاندان پاکستان کی طرف چل پڑا تو ماں بالکل خاموش کھڑی بس دیکھتی ہی رہی۔ اُس کی خاموشی میں بھی اک آواز تھی گویا کہہ رہی ہو کہ یہ نیا وطن اپنا کیسے ہو سکتا ہے۔ جب وہ ہی اپنا نہ ہوا جہاں پیدا ہوئے پلے بڑھے جوان ہوئے تو پاکستان اپنا کیسے ہو جائے گا اگر وہاں سے بھی نکلنا پڑا تو، وطن نہ ہوا پیر کی جوتی ہو گئی۔ جب سب لوگ چلے گئے تو ماں مایوس ہو کر بیٹھ گئی۔

Vol.3 No.4 2020
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

''یہی تو وہ کمرا تھا جسے دولہا کی پیار بھری گود لانگ کر آئی تھی۔ یہیں تو کمسن، خوفزدہ آنکھوں وال بھولی سی دلہن کے چاند سے چہرے پر سے گھونگھٹ اٹھا کر زندگی بھر کی غلامی لکھ دی تھی۔ وہ سامنے بازو کے کمرے میں پہلوٹھی کی بیٹی پیدا ہوئی تھی اور بڑی بیٹی کی یاد ایک دم سے ہوک بن کر کلیجے میں کوند گئی۔ وہاں کونے میں اس کا نال گڑا تھا۔ ایک نہیں دس نال گڑے تھے اور دس روحوں نے یہیں پہلی سانس لی تھی۔ دس گوشت پوست کی مورتیوں نے دس انسانوں نے اسی مقدس کمرے میں جنم لیا تھا۔ اس مقدس کوکھ سے جسے آج وہ چھوڑ کر چلے گئے تھے جیسے وہ پرانی کینچلی تھی جسے کانٹوں میں الجھا کر سب سٹاسٹ سے نکلتے چلے گئے امن اور سکون کی تلاش میں روپے کے چار سیر گیہوں کے پیچھے اور وہ ننھی ننھی ہستیوں کی آغوں آغوں سے کمرہ اب تک گونج رہا تھا۔

لپک کر وہ کمرے میں گود پھیلا کر دوڑ گئیں پر ان کی گود خالی تھی۔ وہ گود جسے سہاگنیں تقدس سے چھو کر ہاتھ کو کوکھ سے لگاتی تھیں آج خالی تھی کمراپڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ دہشت زدہ ہو کر وہ لوٹ پڑیں مگر چھوٹے ہوئے تخیل کے قدم نہ لوٹا سکیں وہ دوسرے کمرے میں لڑکھڑا گئیں یہیں تو زندگی کے ساتھی نے پچاس برس کے نباہ کے بعد منہ موڑا تھا۔ یہیں دروازے کے سامنے کفنائی ہوئی لاش رکھی تھی۔ سارہ کنبہ گھیرے کھڑا تھا۔ خوش نصیب تھے وہ جو اپنے پیاروں کی گود میں سدھارے، پر زندگی کی ساتھی کو چھوڑ گئے جو آج بے کفنائی ہوئی لاش کی طرح لاوارث پڑی رہ گئی۔ پیروں نے جواب دے دیا اور وہیں بیٹھ گئیں جہاں میت کے سرہانے دس برس ان کپکپاتے ہاتھوں نے چراغ جلایا تھا۔ پر آج چراغ میں تیل نہ تھا اور بتی تھی کہ ختم ہو چکی تھی۔(6)

آخر میں ڈاکٹر روپ چند جی واحد متکلم کے گھر والوں کو اسٹیشن سے منا کر واپس لے آتے ہیں اور بھابھی کو خوشخبری سناتے ہیں پہلے اُنہیں یقین نہیں آتا جب اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہیں تو معلوم پڑتا ہے کہ جڑیں اتنی آسانی سے کہاں اپنی جگہ چھوڑتی ہیں۔

بلونت سنگھ کے افسانے ''ویسلے ۸۳'' کا موضوع فسادات کا شکار ہونے والا ایک مہاجر خاندان ہے جو مغربی پنجاب کے ضلع لائلپور سے اپنا سب کچھ لٹا کر اور اپنی جان بچا کر مشرقی پاکستان پہنچے تھے۔ وہاں اُنہیں اپنی شان کے مطابق کوئی مکان نہ ملا تو وہ اک جلے اور خستہ حال مکان میں رہنے لگے۔ شادی جلدی ہو جانے کی وجہ سے بسا کھا سنگھ کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے جو قریباً قریباً سارے جوان تھے۔ بسا کھا سنگھ کا قافلہ موت کا دریا پار کر کے مشرقی پنجاب آیا تھا جو کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

''جابجا سلگتی ہوئی آگ میں چنگاریوں کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتیں۔ کوئی آنکھوں سے اندھی بڑھیا پوپلے منہ سے لرزتی ہوئی بے سری آواز میں شبد گانے لگتی تو دفعتاً شعور و غوغا بلند ہوتا۔ فسادی شب خون مارتے۔ وہ بلا کھٹکے ڈیرے کے اندر در آتے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں تیزی سے بڑھتے اور اچکتے ہوئے دکھائی دیتے۔ افراتفری مچ جاتی۔

جب حملہ آور بچی کھچی گٹھڑیاں اور پوٹلیاں چھین لینے کی کوشش کرتے تو بعض عورتوں کی آہ بکا سے آسمان گونج اُٹھتا لیکن تارے چپ چاپ آنکھیں جھپکا جھپکا کر تماشا دیکھا کرتے۔ مذہبی نعروں، مارو مارو کا شور اور پہریدار سپاہیوں کی بندوقوں کی تڑاتڑ کی صدائیں رفتہ رفتہ مدھم پڑ جاتیں۔ مجبور و معذور کراہتی ہوئی عورتیں اور زخمی انسانوں کے ستے ہوئے چہرے باقی رہ جاتے۔ یہ قافلہ پکے ہوئے پھوڑے کی مانند تھا جسے بار بار چر کے دیئے جاتے تھے اور جو سدا رستا رہتا تھا۔(7)

Vol.3 No.4 2020
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

بسا کھا سنگھ نے یہاں آکر کام ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی لیکن اُسے کہیں کام نہ ملا۔اِس بستی میں آکر بسا کھا سنگھ کی زندگی عجیب کسمپرسی سے گذرنے لگی۔دن رات اُسے ایک ہی خیال ستاتا تھا کہ زندگی یوں کیسے گذرے گی۔یہاں آکر اُسے غربت اور بھوک کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔آہستہ آہستہ یہ خاندان نااُمیدی میں ڈوبتا ہی چلا جارہا تھا۔بیٹیاں شادی کے لائق ہو گئیں تھیں اور بیٹوں کو کوئی کام نہیں مل رہا تھا۔آئے دن فاقے کرنے پڑتے تھے۔ایسے میں اُسے اپنا ایک ہمدرد بدھ سنگھ ملتا ہے۔بسا کھا سنگھ اُسے اپنا ہمدرد پا کر اُسے کہتا ہے کہ اگر کہیں سے ۵۰۰ روپے مل جائیں تو وہ کوئی چھوٹی موٹی دکان شروع کرے مگر بدھ سنگھ اُسے پورے خاندان سمیت گوردوار جانے کی تلقین کرتا ہے مگر مدد نہیں کرتا۔وہ اُسے سمجھاتا ہے کہ اس پاٹ کا پھل دو، چار، دس، بیس، پچاس سال بعد ضرور ملے گا۔یہ بات اُسے اشتعال دلا دیتی ہے۔

بدھ سنگھ اُسے اپنا پستول ویلے ۸۳ دکھاتا ہے جو حال ہی میں اس نے دشمنوں سے حفاظت کے لیے خریدا ہے۔بسا کھا سنگھ اُس سے ویلے ۸۳ لے کر دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔وہ اس سے اس کی قیمت بھی پوچھتا ہے۔بدھ سنگھ چودہ سو روپے بتاتا ہے۔بسا کھا سنگھ پھر دیکھنے لگتا ہے۔ایک بار اُس کا ہاتھ کانپ جاتا ہے مگر پھر وہ دستے کو زیادہ مضبوطی سے پکڑ کر لبلبی پر انگلی رکھ دیتا ہے۔بدھ سنگھ اُسے ہدایت کرتا ہے کہ دیکھنا چل نہ جائے اور بسا کھا سنگھ کی اس کیفیت کو مد نظر رکھ کر پوچھتا ہے ''کیا تم سوچ رہے ہو کہ اگر وقت تمھارے دشمن تمھارے سامنے ہوں تو تم انہیں چنوں کی طرح بھون ڈالو؟'' بسا کھا سنگھ اُس کی دوغلی شخصیت سے واقف ہو چکا ہے اس لیے اُسے اُس کے ہی پستول سے قتل کر دیتا ہے۔

> ''صبح سے شام تک سر سے ایڑی تک پسینہ بہانے والا کوئی بھی آدمی میرا دشمن نہیں ہو سکتا۔اب دھرم صرف دو رہ گئے ہیں ایک دوسروں کا خون چوسنے اور اُنہیں لوٹنے والوں کا اور دوسرا اپنا خون دینے والوں اور لٹنے والوں کا۔اس کے علاوہ تیسرا کوئی دھرم نہیں رہا۔آپ سمجھے ؟آپ نہ جانے کون سے گیان دھیان کی باتیں کیا کرتے ہیں۔وہ باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں۔شائد اس لیے کہ میں بھوکا ہوں میرے بچے بھوکے ہیں میری بیوی بھوکی ہے میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورت کے لیے ترستا ہوں''۔(8)

احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''پرمیشر سنگھ'' کی کہانی ایک سکھ کردار پرمیشر سنگھ کے گرد گھومتی ہے جو سکھوں کے ایک غریب طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔لاہور کا رہنے والا ہے مگر فسادات کی وجہ سے اُسے ہجرت کرنا پڑتی ہے۔اس ہجرت میں وہ اپنی بیٹی امرت کور اور بیوی کے ساتھ ہندوستان پہنچ جاتا ہے اور اس ہجرت میں اسکا ایک بیٹا جس کا نام کرتار سنگھ ہوتا ہے بچھڑ جاتا ہے۔یہ چیز اُس کے دل میں محبت خلوص اور قربانی کے جذبات پیدا کر دیتی ہے اور اس کے دل میں انسانیت کا ایک چشمہ پھوٹ نکلتا ہے۔

اس کے دوست اس کو بدلنے کیلئے کہتے ہیں لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔معاشی حالات اُسے مجبور کر دیتے ہیں کہ گھر کو چلانے کیلئے وہ کہیں ڈاکہ ڈالے۔ڈاکہ ڈالنے جاتا ہے تو اُسے راستے میں پانچ سال کا ایک لڑکا مل جاتا ہے جو مسلمانوں کے ایک قافلے سے بچھڑ گیا ہوتا ہے۔پرمیشر سنگھ کو اُس لڑکے میں اپنے کرتارے کی شکل نظر آنے لگتی ہے اور وہ ساتھیوں سے بچا کر اُسے گھر لے آتا ہے۔

وہ اپنی بیوی اور بیٹی سے کہتا ہے کہ یہ بھی ہمارے کرتارے جیسا ہی ہے لیکن وہ دونوں اختر کو اپنانے سے انکار کر دیتی ہیں۔ایسے میں گرو گرنتھ بھی پرمیشر سنگھ کے گھر آتا ہے اور اُسے حکم دیتا ہے کہ وہ جلد از جلد اختر کو سنگھ بنا دے لیکن پرمیشر سنگھ اس کی پرواہ نہیں کرتا۔لوگوں کو دکھانے کے لیے اُس کے قیس بڑھا دیتا ہے اور پگڑی پہنا دیتا ہے۔وہ اس کو سنگھ اس لیے نہیں بناتا کیونکہ اُسے اپنے کرتارے کا خیال ہوتا ہے کہ اگر اُسے کسی نے زبردستی مسلمان بنا دیا تو کیا ہوگا۔پرمیشر سنگھ کو اپنے گھر میں اکثر قرآن پڑھنے کی آواز آتی رہتی ہے اور ایک دن واقعی اُسے قرآن پڑھنے کی آواز آتی ہے جو اختر پڑھ رہا ہوتا ہے۔پرمیشر سنگھ بھی اُس سے سنتا ہے اور پھر دونوں سو جاتے ہیں۔جیسے جیسے اختر کے قیس بڑھتے جارہے ہیں ویسے ویسے کرتارے کی ماں اُسے قبول کرنے پر رضامند ہوتی جارہی ہے۔

Vol.3 No.4 2020
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ایک دن جب اچانک گاؤں میں فوج آجاتی ہے تو پر میشر سنگھ اختر کو چھپا دیتا ہے اور گاؤں کے ہر فرد سے کہتا ہے کہ وہ لوگ اُس کا ساتھ دیں۔ سارے لوگ پر میشر سنگھ کا ساتھ دیتے ہیں اور فوج خالی ہاتھ لوٹ جاتی ہے لیکن بعد میں پر میشر سنگھ کے دل میں خیال آتا ہے کہ اگر ایسا ہی پاکستان میں بھی ہوا تو اُس کا کرتار ابھی واپس نہیں آئے گا۔ اُس کے ضمیر نے ملامت کی اور اُس نے فوراً فیصلہ کیا کہ وہ اختر کو پاکستان اُس کی ماں کے پاس چھوڑ آئے گا۔ وہ اپنے اس فیصلے پر عمل کرتا ہے اور اختر کو پاکستان کی سرحد پر چھوڑنے کے لیے چلا جاتا ہے مگر اُس کی پگڑی اتارنا اور بال کاٹنا بھول جاتا ہے۔ سرحد پر جا کر پر میشر سنگھ اختر سے کہتا ہے کہ جس طرف سے اذان کی آواز آرہی ہے اُس طرف چلے جاؤ۔

جب اختر سرحد عبور کرتا ہے تو دو سپاہی اُس کو پکڑ لیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو تو جواب میں اختر اپنا نام بتاتا ہے لیکن جب سپاہی اُس کی پگڑی اُتارتے ہیں تو اُس کے لمبے بال نظر آنے لگتے ہیں۔ اتنے میں گولی کی آواز آتی ہے جو پر میشر سنگھ کی ران میں لگتی ہے اگرچہ وہ اُسے باندھ لیتا ہے لیکن خون رسنا بند نہیں ہوتا۔ پر میشر سنگھ سپاہیوں سے کہتا ہے:

''مجھے کیوں مارا تم نے؟ میں تو اختر کے قیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یار''۔(9)

منٹو کا افسانہ ''گور مکھ سنگھ کی وصیت'' بھی فسادات کے موضوع پر لکھا جانے والا افسانہ ہے۔ جس کی کہانی امر تسر میں رہنے والے ایک ریٹائرڈ جج عبدالحئ اور اُس کی ایک بیٹی اور بیٹے کے گرد گھومتی ہے۔ امر تسر میں رہنے والے دیگر لوگوں کی طرح عبدالحئ کا بھی یہی خیال تھا کہ موجودہ حالات زیادہ عرصہ تک نہیں رہیں گے۔ جوش ہے جونہی ٹھنڈا پڑے گا حالات پھر اپنی اصلی حالت میں آجائیں گے۔ مگر حقیقت میں ایسا بالکل بھی نہیں ہوا اور حالات روز بروز بگڑتے ہی چلے گئے۔ ہندوؤں کے محلے میں جو مسلمان رہتے تھے وہ وہاں سے بھاگنے لگے اور مسلمانوں کے محلے میں رہنے والے ہندو بھی اپنا گھر بار چھوڑ کر جانے لگے۔

عبدالحئ جج کو بھی لگتا تھا کہ حالات ضرور ٹھیک ہو جائیں گے اس لیے احتیاط کے طور پر اُنہوں نے کافی سارا راشن لے کر گھر میں بھر لیا تاکہ اگر حالات خراب بھی ہو ں اور دکانیں وغیرہ بند ہو جائیں تو کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ پہلے پہل جب کسی کے گھر میں آگ لگتی تھی تو فائر بریگیڈ آجاتے تھے مگر بعد میں آہستہ آہستہ وہ بھی آنا بند ہو گئے۔ ایسے میں جج صاحب کو فالج ہو گیا اور وہ ایک طرف سے معذور ہو گئے۔ باہر حالات ایسے تھے کہ کسی ڈکٹر کو بھی نہیں بلوایا جا سکتا تھا۔ دن گذرتے گئے ایک دن اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو سب گھبرا گئے عبدالحئ نے کہا کھولو گور مکھ سنگھ ہو گا۔ گور مکھ سنگھ ہر سال عید سے ایک روز پہلے سویوں کا ایک تھیلا لاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبدالحئ نے اپنی ریٹائرمنٹ سے پہلے اُس کا کوئی کام کیا تھا۔

اُس کا احسان محسوس کرتے ہوئے وہ دس سال سے یہ کام کر رہا تھا عبدالحئ کی بیٹی صغریٰ نے دیکھا تو گور مکھ سنگھ نہیں تھا جوان لڑکا تھا ابھی وہ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اُس نے دروازہ پھر کھٹکھٹایا۔ صغریٰ کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ گور مکھ سنگھ کا بیٹا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ گور مکھ سنگھ کا انتقال ہو گیا ہے اور انہوں نے مجھے نصیحت کی تھی۔

''دیکھو بیٹا میں جج صاحب کی خدمت میں پورے دس سال سے ہر چھوٹی عید پر سویاں لے جاتا رہا ہوں.....یہ کام میرے
مرنے کے بعد تمھیں کرنا ہو گا.....میں نے انہیں وچن دیا تھا جو میں پورا کر رہا ہوں.....لے لیجئے سویاں''۔(10)

صغریٰ اس قدر متاثر ہوتی ہے کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ گور مکھ سنگھ کا بیٹا پوچھتا ہے کہ کیا بیماری ہے جج صاحب کو تو صغریٰ بتاتی ہے کہ فالج ہے جس پر گور مکھ سنگھ کا بیٹا کہتا ہے اگر سردار جی زندہ ہوتے تو اُنہیں سن کر ضرور دکھ ہوتا۔ وہ آخری عمر تک بڑے احسان مند تھے جج صاحب کے، کہتے تھے انسان نہیں دیوتا ہے۔

Vol.3 No.4 2020
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

''کیوں سردار جی اپنا کام کر آئے؟ ستو سنگھ نے جواب دیا ''ہاں کر آیا''اس آدمی نے ڈھاٹے کے اندر ہنس کر پوچھا تو کر دیں معاملہ ٹھنڈا جج صاحب کا؟.....ہاں.....جیسے تمہاری مرضی'' یہ کہہ کر سردار گورمکھ سنگھ کالڑکا چل دیا''(11)

قدرت اللہ شہاب کا افسانہ ''یاخدا'' اگرچہ ناول نہیں ہے لیکن اُس کی طوالت اور موضوع کے اعتبار سے وہ ناول ہی بن گیا ہے اس افسانے میں بنیادی کردار دلشاد کا ہے لیکن بعد میں ایسا ہی ایک اور کردار زبیدہ بھی اُس کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے دونوں نے ہجرت اور فسادات میں اپنا سب کچھ گنوا دیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی عزت بھی لٹا دی۔ صرف اس لیے کہ وہ ایک مقدس ملک میں جائیں گی۔

دلشاد کا باپ جو چمکور کی ایک مسجد میں امام ہوتا ہے ہجرت کے دروان سکھوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے اور مسجد کی ذمہ داری دلشاد کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب دلشاد سے اُن لوگوں کا دل بھر جاتا ہے تو وہ احسان کے طور پر اُسے تھانے چھوڑ جاتے ہیں تھانے والے بھلا کب معافی دینے والے تھے اُنہوں نے بھی اپنا حصہ نکال کر دلشاد کو مقدس سرزمین تک پہنچا دیا یہاں دلشاد کی ملاقات زبیدہ اور اُس کے بھائی سے ہوتی ہے جن کا داد دلشاد کے سامنے ہی مر جاتا ہے یوں زبیدہ اور دلشاد کی کہانی آپس میں مل جاتی ہے۔

اس اجنبی دیس میں جہاں اُن کا اپنا کوئی بھی نہ تھا اور دونوں کے کندھوں پر ایک ایک ذمہ داری بھی ہے۔ دلشاد کے کندھوں پر اُس کی بچی کی ذمہ داری ہے جو ان فسادات کی نشانی ہے اور زبیدہ کے کندھوں پر اُس کے بھائی کی ذمہ داری ہے۔ اُن دونوں کو پالنے کے لیے لے دے کے اُن دونوں کے پاس جسم رہ جاتے ہیں جن کو بیچ کے وہ اُن کی پرورش کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ان جسموں کو استعمال کرنے سے عار محسوس کرنے کی صلاحیتیں اُن کے اپنے ہی ہم وطن بھائیوں نے چھین لی تھیں سو اب اس میں اُنہیں کوئی برائی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ شہاب صاحب نے اپنے اس افسانے میں صرف ماضی یا حال کا ہی ذکر نہیں کیا بلکہ مستقبل کی طرف بھی بڑے ہی واضح اشارے کیے ہیں:

''کچھ پنجابیوں نے کنڈیکٹر کو فصیح و بلیغ گالیاں دیں ''سالے سندھی'' مفت میں پاکستان مل گیا سالوں کو ہم ابھی دو دن میں مزاج ٹھکانے لگا دیں گے ہاں'' کنڈیکٹر اور ڈرائیور ایک طرف نکل کر کھڑے ہو گئے۔ ''سالے پنجابی پٹ پٹا کر یہاں آئے تو سالوں کا دماغ ہی نہیں ملتا۔ ایک ہندو راہ گیر یہ قصیدہ سن کر ٹھہر گیا اور داد کے طور پر اُس نے کنڈیکٹر اور ڈرائیور کو ایک ایک بیڑی پیش کی۔ دو بنگالی یہ تماشا دیکھ کر بس سے نیچے اُتر آئے.....لڑنے دو سالے سندھیوں اور پنجابیوں کو کہتے ہیں پاکستان کی زبان اُردو ہو گی۔ چھی گویا شر نو بنگلہ بھاشا ہماری قومی زبان نہیں .....چھی''(12)

اشفاق احمد کا مختصر افسانہ ''گڈریا'' بھی فسادات کا موضوع لیے ہوئے ہے۔ اس افسانے میں اور اس موضوع پر لکھے جانے والے دیگر افسانوں میں فرق یہ ہے کہ اس میں فسادات کی ٹریجڈی اور حکمرانوں کی بے حسی اور ہم وطنوں کی جنسی ہوس کو موضوع نہیں بنایا گیا بلکہ سارا افسانہ ایک ہی کردار ''داؤ جی'' کے گرد گھومتا ہے۔ اشفاق احمد کا داؤ جی حضرت اسماعیل چشتی کا شاگرد ہے فارسی اچھی طرح جانتا ہے۔ اپنی بیٹی کی شادی پر سب سے زیادہ اس بات پر خوش ہے کہ اُس کا سمدھی فارسی کا اُستاد ہے۔ بیٹی کو گلستان، بوستان اور کریما زبانی یاد کروائی ہے۔

بیٹی کو ڈولی میں بٹھا کر لاحول واللہ پڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔ اشفاق احمد کا داؤ جی نہ صرف فارسی زبان اور عربی زبان بڑی اچھی جانتا ہے بلکہ جس نے اُسے لکھایا، پڑھایا ہے اُس کی دل و جان سے عزت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے ساتھ اُن کی رغبت بھی بے مثل ہے اس کا ایک نمونہ دیکھئے:

Vol.3 No.4 2020
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

''میں تو اُس کے کتوں کا بھی کتا جس کے سر مطہر پر مکے کی کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی.....آقائے نام دار کا ایک ادنی حلقہ بگوش پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ وشیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پر۔ وہ اپنے محبوب کے طفیل نار جہنم سے بچائے خدائے ابرہیم مجھے جرات عطا کر مولائے ایوب مجھے صبر کی نعمت دے''(13)

فسادات شروع ہوتے ہیں تو اشفاق کا یہ داؤ جی بھی اُس زد میں آجاتا ہے جو ساری زندگی جاہلوں کی اس بستی میں علم کے موتی بکھیرتا رہا ہے۔ اس افسانے میں اشفاق احمد نے داؤ جی کی لاش کو خون میں لت پت نہیں دکھایا ہے نہ ہی اُس کا گھر جلتا ہوا دکھایا ہے جہاں داؤ جی بے یار و مددگار اُس جلتے ہوئے گھر کو دیکھ رہا ہو بلکہ کچھ ایسے مسلمان اُسے گھیر لیتے ہیں جو بس نام کے مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ داؤ جی سے کلمہ سنانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ داؤ جی اُن سے استفسار کرتے ہیں کہ کون سا کلمہ سناؤں؟ یہ بات اُن نام نہاد مسلمانوں کے خون کو گرما دیتی ہے اور داؤ جی پر ایک قیامت بن کر ٹوٹتی ہے۔

''رانو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤ جی کی بودی کاٹ دی.....پھر اس نے داؤ جی کی ٹھوڑی اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا'' کلمہ پڑھ پنڈتا'' اور داؤ جی آہستہ سے بولے.....کونسا؟''

رانو نے ان کے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا'' سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں''جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا''چل بکریاں تیرا انتظار کرتی ہیں''.....اور ننگے سر داؤ جی بکریوں کے پیچھے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فرید اچل رہا ہو۔''(14)

عبداللہ حسین کا ناول ''اُداس نسلیں''اردو ادب کے بڑے ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ناول کسی ایک موضوع کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ فسادات کے علاوہ تقسیم اور ہجرت کو نصف صدی کے پس منظر میں دکھایا گیا ہے۔ اس کا آغاز تقریباً1913ء سے ہوتا ہے اور سیاسی تاریخ کا یہ وہ دور ہے جب تحریک آزادی اپنی ابتدائی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ پہلے منظر نامے میں ایک تقریب کا ذکر آتا ہے جہاں بڑے بڑے لوگ مدعو ہیں اور یہیں پر ناول کا مرکزی کردار بھی سامنے آتا ہے جو انگریزوں سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ نوجوان ذہنوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت پرورش پا رہی ہے۔ روشن آغا کے والد ایک معمولی اہل کار تھے 1857ء میں کرنل جانس کی جان بچانے کے عوض اُنہیں روشن پور کی جاگیر عطا کی گئی آج اُس کے پوتے کی رسم تاج پوشی ہے۔ نعیم روشن آغا کے بچپن کے دنوں کے دوست محمد بیگ کا پوتا ہے جس کو روشن آغا نے اپنی طرف سے 50 مربے کی جاگیر دی تھی مگر اُن کے بڑے بیٹے کی خود سری کی وجہ سے نہ صرف وہ جاگیر ضبط ہوئی بلکہ سزا بھی بھگتنا پڑی نعیم ناول کا مرکزی کردار ہے جو زمانے کی سختیاں برداشت کرتا ہے۔

عبداللہ حسین نے یہ ناول تقریباً نصف صدی تک پھیلا دیا ہے۔ جس میں زندگی کی ہر حوالے سے ترجمانی ہے، جاگیرداروں کے کسانوں پر مظالم سے لے کر جیل کی بامشقت زندگی اور کارخانے کے مزدوروں کی زندگی تک عبداللہ حسین نے زندگی کے ہر پہلو کو مکمل جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اُنہوں نے ہر شعبے کی یوں تصویر کشی کی ہے کہ جیسے یہ سب ناول نگار کا اپنا تجربہ ہو۔

ہجرت اور فسادات کے اس المیے کو جس قدر تفصیل سے اداس نسلیں میں بیان کیا گیا ہے کسی اور جگہ نہیں کیا گیا۔ فسادات کے ان حالات میں ناول کا ہیرو بھی ایک قافلے کے ساتھ پیدل ہی پاکستان کی طرف چل پڑتا ہے راستے میں آنے والی مشکلات کا بھی عبداللہ حسین نے بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ عبداللہ حسین کا ہیرو وزارت تعلیم میں انڈر سیکرٹری ہونے کے باوجود بے چینی کی کیفیت میں ہے۔ یہ سارے معاملات صرف نعیم کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ یہ المیہ تو اُس دور کے ہر بندے کا المیہ ہے جو اُس دور میں سانس لے رہا تھا۔ اُداس نسلیں نے اپنے دور کی بے چینی کرب کو پورے طور پر عوام میں منتقل کر دیا ہے۔

Vol.3 No.4 2020
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

''انہیں چلتے ہوئے نو روز ہو چکے تھے۔اب جالندھر کے قریب پہنچ رہے تھے۔حالاں کہ آدھے سے زیادہ نئے لوگ اس میں شامل ہو چکے لیکن قافلے کا حجم حیرت انگیز طور پر گھٹتا جارہا تھا اس کی وجہ یہ تھی کی جوں جوں وہ پنجاب میں اندر آتے گئے حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا پچھلے پچاس میل سے اچانک انہیں اپنے رستے میں مردہ اور نیم مردہ انسانی جسم ملنا شروع ہو گئے تھے جو سڑک پر اور آس پاس کے کھیتوں میں بکھرے پڑے تھے اور پتا دیتے تھے کہ ان سے آگے آگے ایک اور قافلہ رواں تھا۔ایک مہیب زخمی جانور کی طرح جو خون کی لکیر چھوڑتا ہوا آگے آگے بھاگ رہا ہو''۔(15)

نسیم حجازی بلاشبہ ایک بڑے ناول نگار ہیں اُن کا ناول ''خاک اور خون'' بھی اُردو ادب کے بڑے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔لیکن نسیم حجازی کے اس ناول میں ایک سقم ہے کہ یہ یک طرفہ ہے اور صرف پاکستان اور کشمیر میں ہونے والے فسادات کو سامنے لاتا ہے اگر اسے بُھلا دیا جائے تو نسیم حجازی کا یہ ناول بھی اُردو کے صف اول کے ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔یعنی اگر اس کو صرف فنی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس میں کسی قسم کی کوئی فن خامی دکھائی نہیں دیتی۔کہانی ضلع گورداس پور کے ایک گاؤں کی منظر کشی سے شروع ہوتی جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔دیہاتی ماحول ہے جہاں مسلمانوں کے علاوہ سکھ، ہندو اور عیسائی سب رہتے تھے۔زمینداروں کے درمیان روایتی، دشمنیاں بھی تھیں اور دوستیاں بھی۔اُس گاؤں کے سب بچے ایک دوسرے گاؤں میں پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔مجموعی طور پر گاؤں کی فضا میں محبت رچی بسی ہوئی تھی۔اس گاؤں میں ایک گھر چوہدری احمد علی کا بھی تھا جو اس گاؤں کے بڑوں میں شمار ہوتا تھا۔چوہدری احمد علی کا پوتا سلیم جو سکول جانے والے بچوں میں سب سے چھوٹا تھا مگر اپنی خداداد صلاحیت اور ذہانت کی بنا پر سب میں نمایاں تھا۔گاؤں کے سکول سے فراغت کے بعد سلیم شہر کے کالج میں داخل ہوتا ہے تو تحریک آزادی اپنے آخری مراحل میں داخل ہوتی ہے۔ہر مسلمان نوجوان کی طرح سلیم بھی اپنے ایک سنیئر دوست کی رہنمائی میں تحریک میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔1946ء کے انتخابات کی مہم میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیتا ہے اور گرفتار کر لیا جاتا ہے بعد میں لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو جاتے ہیں جو آہستہ آہستہ پورے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔سلیم کا آبائی گاؤں چونکہ مسلم اکثریتی گاؤں ہے اس لیے اُس کے پاکستان میں شامل ہونے کے امکانات تھے اور اسی بات کے پیش نظر تمام غیر مسلم چوہدری احمد علی کے پاس پناہ کے لیے آئے تھے اور چوہدری احمد علی نے انہیں تحفظ کا بھرپور یقین دلایا تھا۔مگر ریڈ کلف ایوارڈ کے تحت گورداس پور انڈیا کے حصے میں آگیا اور وہ تمام غیر مسلم جو کل تک چوہدری احمد علی سے زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے وہی چوہدری احمد علی کی حویلی پر حملہ کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔سب لوگ مل کر حویلی پر حملہ ہوتے اور پسپا ہو کر اور کچھ لاشیں چھوڑ کر چلے جاتے۔

آخر کار باؤنڈری کے سکھ، گورکھا، ڈوگرا اور مرہٹہ سپاہی اس حویلی تو فتح کرتے ہیں اور آگ لگا دیتے ہیں۔صرف سلیم اور چچازاد بھائی مجید کسی نہ کسی طرح اسلحہ کے ساتھ جان بچا کر بھاگ جاتے ہیں اور پاکستان کا رخ کرتے ہیں۔راستے میں کچھ اور لوگ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں تو سلیم اور مجید اُن کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔راستے میں کئی جگہوں پر اُن پر حملہ بھی ہوتا ہے مگر دونوں بڑی بہادری سے لڑتے ہیں نہ ہمت ہارتے ہیں اور نہ اُن لوگوں کا ساتھ چھوڑتے ہیں لٹے پٹے قافلوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے نسیم حجازی لکھتے ہیں:

''پاکستان اب لاکھوں بھوکے' ننگے اور بے سرو سامان انسانوں کی جائے پناہ اور ہزاروں زخمیوں کا ہسپتال بن چکا تھا۔اب مشرقی پنجاب کے شہر اور بستیاں خالی ہو چکی تھیں۔اب حملہ آوروں کے سامنے کیمپ تھے یا قافلے تھے۔باؤنڈری فورس توڑی جا چکی تھی اور مسلمانوں کے قتل عام کے راستے میں جو رہی سہی رکاوٹیں تھیں۔وہ بھی دور ہو چکی تھیں۔دہلی سے لے کر واہگہ تک پناہ گزینوں کے قافلوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔بیشتر قافلوں کی منزل مقصود لاہور تھی۔لاہور میں روزانہ کئی کئی میل لمبے قافلے روانہ ہو رہے تھے۔لاہور کی سڑکوں لاہور کی گلیوں، لاہور کے اسٹیشن اور لاہور کے کیمپوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی(16)

Vol.3 No.4 2020
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن''1962ء میں منظر پر آیااور یہ جدوجہد آزادی کے سفر کو موضوع بنانیوالے ناولوں کی روایت میں ایک خوبصورت اضافہ تھا۔ کہانی کا مرکزی کردار عالیہ ہے۔ عالیہ نے ایک کشیدہ زدہ ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ گھر کی کشید گی اُس کے پھوپھی زاد بھائی صفدر کی وجہ سے ہے جو بعد میں علیگڑھ چلا جاتا ہے اور پھر لوٹ کر کبھی گھر نہیں آتا۔ گھر میں دونوں طرح کے لوگ موجود ہیں یعنی کانگرس کی حمایت کرنے والے بھی اور مسلم لیگ کی حمایت کرنے والے بھی۔

عالیہ کے ابا جو سرکاری ملازم ہیں لیکن انگریز سے نفرت کرتے ہیں اسی نفرت کے نتیجے میں وہ اپنے ایک انگریز افسر کا سر پھاڑ دیتے ہیں اور اسی جرم میں اُنہیں جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور وہیں زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔ عالیہ کی بڑی بہن صفدر سے محبت کرتی ہے اور اُس سے شادی کرنا چاہتی ہے مگر ماں اس شادی کی مخالف ہے صفدر کے چلے جانے کے بعد عالیہ کی ماں عالیہ کے بڑے چچا کے بیٹے جمیل سے تہمینہ کی .....شادی کر دیتی ہے۔ اسی دوران صفدر کا ایک خط آتا ہے اور تہمینہ خودکشی کر لیتی ہے۔

عالیہ اب گھر میں اکیلی رہ گئی ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو دلاسا دیتی ہے۔ اس ناول میں ایک کردار چھمی کا بھی ہے جو عالیہ کی چچازاد بہن ہے۔ چھمی کی ماں کے مرنے کے بعد اُس کے باپ نے دوسری شادی کر لی اور چھمی کو ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا۔ چھمی کا باپ کانگرس میں ہے اس لیے چھمی گھر میں مسلم لیگ کے جلسے کرواتی ہے اور گلیوں میں جلوس نکلواتی ہے۔

جمیل بھائی پہلے چھمی سے محبت کا اظہار کرتے ہے مگر عالیہ کے آجانے کے بعد وہ اُس سے محبت کرنے لگے۔ پاکستان بننے کے بعد عالیہ کے ماموں اپنی انگریز بیوی کو لے کر لاہور آجاتے ہیں اور عالیہ اور اُس کی ماں کو بلوا لیتے ہیں۔ لاہور آکر عالیہ دن میں ایک سکول میں پڑھاتی ہے اور رات میں مہاجر کیمپ میں لٹے پٹے مہاجرین کی خدمت کرتی ہے۔ ایک دن اخبار کے ذریعے اُسے پتا چلتا ہے کہ اُس کے چچا کو ایک ہندو نے قتل کر دیا اور پنڈت نہرو نے اُس کے لیے 3ہزار روپے مالی امداد کا اعلان کیا ہے۔ چھمی پاکستان آنے پر راضی نہ ہوئی تو اس کے خاوند نے اسے طلاق دے دی مگر جمیل نے اُس سے شادی کر لی تو عالیہ کو لگا جیسے وہ چھمی سے شکست کھا گئی ہے۔

خدیجہ مستور کا یہ ناول جہاں ہجرت اور فسادات کی داستاں لیے ہوئے ہے وہاں خدیجہ مستور نے سیاسی چالوں کو بھی مد نظر رکھا ہے۔ سیاست کے یہ اثرات گھر کے افراد کی زندگیوں پر محسوس کیے جا رہے ہیں۔ خدیجہ مستور نے اس ناول میں پرانی تہذیب کی نمائندہ عالیہ کی بوڑھی دادی کا ذکر بھی کیا ہے جو وقت کے مطابق اپنے آپ کو نہیں ڈھالتی اور اپنے میاں کی ناجائز اولاد اسرار میاں سے سمجھوتا کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔

اسرار میاں جاگیر دارانہ پستی کی علامت ہیں جہاں تاریکی میں بڑے بڑے عزت دار زمیندار مجبور لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں اور ناجائز اولادوں کی تخلیق کو باعث فخر سمجھتے ہیں دوسری طرف ہندو روایات کی بھی تصویر کشی کی ہے جس نے عورت ذات کو دکھوں میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ کسم جو ایک بیوہ ہے اور ہندو معاشرے کے ظام روایت سے تنگ آکر خودکشی کر لیتی ہے۔

آنگن کی کہانی دو طبقوں کی کہانی ہے۔ ایک طبقہ پاکستان کا حامی ہے جو مذہبی تحفظ کے پس پردہ اپنے مفادات کے لیے کام کر رہا ہے۔ دوسرا وہ طبقہ ہے جو انگریز سے آزادی کو اپنے لیے بڑی نعمت تصور کرتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ آزادی کے بعد اُسے ابدی مسرت حاصل ہو جائے گی اور اُس کے بعد مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

ناول میں سامراجی حکومت کے خلاف رد عمل بھی دکھائی دیتا ہے جہاں عالیہ کی ماں اس بات پر فخر کرتی ہیں کہ اُس کی بھابھی انگریز ہے اور اسی وجہ سے وہ انگریزی حکومت کو بھی درست قرار دیتی ہے جبکہ عالیہ کے والد انگریزوں کے بے حد خلاف ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ انگریز کے ملازم بھی ہیں اس موقع پر عالیہ کی ماں کہتی ہیں۔

''تم کو اللہ واسطے کا بیر ہے انگریزی سے جس تھالی میں کھاؤ اسی میں چھید کرو''(17)

Vol.3 No.4 2020
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

خدیجہ مستور کا انداز بیان نہایت دلکش الفاظ سادے اور شیریں اور جملے سبک اور متوازن ہوتے ہیں جبکہ ناول کی زبان عام فہم اور مصنف کی چابکدستی اور فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آنگن کے مکالمے فطری اور سادہ ہیں خاص طور پر عالیہ کی ماں اور چھمی کے مکالمے جلی کٹی سنانے اور طنز جب کے نجمہ پھوپھی اپنی خود پسندی اور تکبر کی وجہ سے منفرد ہیں اور اپنی جگہ ناول میں دلچسپی قائم رکھنے کا سبب بنتے ہیں اس بارے میں محمد صدیق شبلی رقمطراز ہیں:

> ''جس ماحول سے یہ ناول تعلق رکھتا ہے وہاں آنگن گھر کا ایک اہم ترین حصہ ہے۔ کبھی تو آنگن اتنا مختصر لگتا ہے کہ اس میں رہنے والے لوگ اپنے ذاتی مسائل میں اُلجھے نظر آتے ہیں اور کبھی اس میں اتنی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ پورا ملک آنگن لگتا ہے جس کی سیاست سے اس گھر کے رہنے والے بھی متاثر ہو رہے ہیں''(18)

حوالہ جات

1۔ محمد عقیل، تقسیم ہند اور اردو ناول

2۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو افسانہ اور افسانہ نگار، مکتبہ جامع لمیٹڈ، دہلی، 1982ء ص19

3۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ محمد حسن عسکری، فسادات اور انقلاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1997ء ص109

4۔ انور سجاد، ڈاکٹر، مجموعہ ڈاکٹر انور سجاد، چوراہا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2003ء ص32

5۔ انور سجاد، ڈاکٹر، مجموعہ ڈاکٹر انور سجاد، چوراہا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2003ء ص37

6۔ عصمت چغتائی، عصمت چغتائی کے ۱۰۱ افسانے، چودھری اکیڈمی، لاہور، 2013ء ص445

7۔ بلونت سنگھ، راستہ چلتی عورت اور دیگر منتخب افسانے، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، الحمرا پبلشنگ، 2001ء اسلام آباد، ص122

8۔ بلونت سنگھ، راستہ چلتی عورت اور دیگر منتخب افسانے، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، الحمرا پبلشنگ، 2001ء اسلام آباد، ص133

9۔ احمد ندیم قاسمی، افسانے چالیس خود منتخب کردہ بہترین افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز، 2003ء لاہور، ص231

10۔ سعادت حسن منٹو، گورمکھ سنگھ کی وصیت، یزید، منٹو نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، 1990ء لاہور، ص115

11۔ سعادت حسن منٹو، گورمکھ سنگھ کی وصیت، یزید، منٹو نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، 1990ء لاہور، ص116

12۔ قدرت اللہ شہاب، سرخ فیتہ، سنگ میل پبلی کیشنز، 2014ء لاہور، ص51

13۔ اشفاق احمد، گڈریا، اجلے پھول، سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء لاہور، ص26

14۔ اشفاق احمد، گڈریا، اجلے پھول، سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء لاہور، ص49

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.3 No.4 2020

15۔ عبداللہ حسین، آگ کا دریا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص508

16۔ نسیم حجازی، خاک وخون، جہانگیر بکس، سن ندارد، لاہور، ص527

17۔ خدیجہ مستور، آنگن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1999ء ص23

18۔ محمد صدیق شبلی، نصاب اُردو بی۔اے، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، سن ندارد، اسلام آباد، ص46